جہانِ دگر
نوید ظفر کیانی

بسم الله الرحمن الرحیم

نوید ظفر کیانی

http://naveedzafarkiani.wordpress.com
www.facebook.com/nzkiani

مشتری ہوشیار باش

کتاب کا نام — جہانِ دگر۔

شاعر — نوید ظفر کیانی۔

وضاحت — یہ نوید ظفر کیانی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے برقی کتاب کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

صفحات — ۱۵۵

سالِ اشاعت — ۲۰۱۷ء

سنِ اضافہ — ۲۰۱۷ء

پبلشر — نوید ظفر کیانی۔

ویب سائٹ — http://naveedzafarkiani.wordpress.com

فیس بک — http://www.facebook.com/nzkiani

برقی ڈاک — nzkiani@gmail.com

ترتیب

جہار دنگ

جہاں دیگر

جہارِ نگ

اللہ

زندگی ہے کہکشاں در کہکشاں
داستاں ہے اور وہ معجز بیاں

ایک تابانی سے رخشندہ ہوئے
دامنِ افلاک پر کتنے نشاں

نظم ایسا رخنہَ جنبش نہیں
اک طلسم اندر مکان و لامکاں

دل کی دھڑکن کی طرح حرکت میں ہیں
دور تک پھیلے ہوئے سیارگاں

ایستادہ ہیں صفیں چاروں طرف
اور سجدہ ریز ہیں کرّوبیاں

اُس کے ذکرِ پاک سے ہے رقص میں
ابتسامِ وقت کی موجِ رواں

چشمہء ادراک پر بجتے دیے
اُس کی عظمت کے نقوشِ جاوداں

اُس کی صناعی کی دستاویز ہے
ہر نشانی از کراں تا بہ کراں

اُس کی تخلیقات کی پہنائی میں
کچھ نہیں ہے یہ زمیں، یہ آسماں

ذرّے ذرّے سے مخاطب ہے مجھے
کس قدر مستوُر ہے کتنا عیاں

جہانِ دیگر

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

حیات کچھ نہیں جو اُن صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نہیں ہوئے تو
سفر عبث ہیں جو سوئے حرم نہیں ہوئے تو

زمانے اپنی ہی نظروں سے گرتے جائیں گے
اگر بلند نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم نہیں ہوئے تو

یقین کر لو کہ ہم تم بھٹک گئے ہیں کہیں
دیارِ پاک کی جانب قدم نہیں ہوئے تو

وہی نکالیں تو نکلیں گے بحرِ عصیاں سے
وجودیت کے خسارے عدم نہیں ہوئے تو

عمل کا کوئی دیا حشر میں نہ لو دے گا
ہمارے ساتھ جو خیر الامم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوئے تو

جہاز دیکھ

حوالہ اُن صلی اللہ علیہ وسلم کا میسر ہے تو کسے پرواہ
نگاہِ دہر میں ہم محترم نہیں ہوئے تو

عمل نے جامۂ سنت درست پہنا نہیں
اگر فقیری میں رنگِ حشم نہیں ہوئے تو

دکانِ وقت سے کیا سرخوشی خریدیں گے
کرم کے سکے ہی ہم کو بہم نہیں ہوئے تو

ہم اُن صلی اللہ علیہ وسلم کو نعت کی مسجد میں کیسے آنے دیں
جو شعر خونِ جگر سے رقم نہیں ہوئے تو

جہارِ دیگر

حسینؑ

سر کیوں اُٹھائے ظلم کہ تسطیر ہے حسینؑ
غیرت نے جو لکھی ہے وہ تحریر ہے حسینؑ

لمحہ بہ لمحہ وقت کے ہاتھوں میں اک دیا
حلقہ بہ حلقہ ایک ہی زنجیر ہے حسینؑ

کیسے عدوئے دین کی بر آئے آرزو
دینِ مبیں کے ہاتھ میں شمشیر ہے حسینؑ

ہر دور کے یزید پہ جس کا ہے دبدبہ
تا بہ ابد وہ نعرۂ تکبیر ہے حسینؑ

جبارِ ذیگا

تاریخ کے منڈیر کی قندیل کربلا
گویا ہر اک زمانے کی تنویر ہے حسینؑ

جو مقصدِ حیات دیا ہے قران نے
اُس مقصدِ حیات کی تفسیر ہے حسینؑ

حق چھا گیا جہاں میں ہمیشہ کے واسطے
بے نام ہے یزید، جہانگیر ہے حسینؑ

بخشی ہیں سربلندیاں نانا کے دین کو
انسانیت کا تمغۂ توقیر ہے حسینؑ

جہاں دیدہ

داغِ عشق کو برباد نہ رکھا جائے
اہتمام ایسا مرے بعد نہ رکھا جائے

اپنی مٹی کی بھی خوشبو نہیں آتی اُس کو
آسمانوں پہ زمیں زاد نہ رکھا جائے

کاش اِس بات کی توفیق ہمیں بھی ہوتی
جو ہمیں بھولیں اُنہیں یاد نہ رکھا جائے

اِس زمانے کی تو تخلیق ہے بونوں کے لئے
سو یہاں پر قدِ شمشاد نہ رکھا جائے

یا تو بھرنے دیا جائے مجھے کردار میں رنگ
یا مجھے شاملِ روداد نہ رکھا جائے

ہر زمانے میں محبت کے تقاضے ہیں جدا
ہر دفعہ قصۂ فرہاد نہ رکھا جائے

خود کو بس ایک ہی خوشبو میں بسانا اچھا
یونہی مجموعۂ اضداد نہ رکھا جائے

اِس قدر بھی نہ اجاڑو کہ سرِ بزمِ وفا
مسکراہٹ کو بھی آباد نہ رکھا جائے

سارے جیون کو نشاں زد کیے جاتا ہے ظفرؔ
آئینے کو میرا نقاد نہ رکھا جائے

جہاں دیگر

دلِ درد آشنا رکھے ہوئے ہیں
بدن میں کربلا رکھے ہوئے ہیں

کسی کے رنگ میں ڈھلتے نہیں ہیں
ہم اپنی کیمیا رکھے ہوئے ہیں

ہمیں تفہیمِ دنیا کے معمے
خلا اندر خلا رکھے ہوئے ہیں

کوئی منزل نہیں منزل ہماری
اِک آتش زیرِ پا رکھے ہوئے ہیں

لڑائی ظلمتِ شب سے ہے جاری
سرِ بام اِک دیا رکھے ہوئے ہیں

ہمارے سامنے ہیں پر وہ یوں ہیں
نہ ہونے کی ادا رکھے ہوئے ہیں

جو موسم پہن کر آئے ہیں سورج
وہ دامن میں گھٹا رکھے ہوئے ہیں

دلیلِ خامشی کام آ رہی ہے
کسی کو بے نوا رکھے ہوئے ہیں

جہارِ دیگر

اب چراغاں کب کسی بھی آرزوئے دل میں ہے
زندگانی مسترد کردہ کسی فائل میں ہے

دل کا خوں ہونا کسی اپنے کے ہاتھوں ہے روا
جو بہت پیارا ہے ہم کو فرقۂ قاتل میں ہے

دیکھ لی ہیں زندگی میں ہر طرح کی مشکلیں
اب تو جو مشکل بھی ہے معمول کی مشکل میں ہے

کشتیوں کے ساتھ کرتا ہے سفر اپنا شروع
یہ جو ہے گرداب یہ بھی کنبۂ ساحل میں ہے

قہقہے، موسیقی کی آواز، باتیں۔۔۔سب سراب
میں کہاں میرا اکیلا پن ہے جو محفل میں ہے

زندگی ہے وقت کے بے رحم صحرا میں مگر
بہرِ فردا اب بھی کوئی واہمہ محمل میں ہے

مسکراہٹ اور آنسو

پھر وہی شب کا سمے ہے، پھر وہی گہرا سکوت
پھر وہی آنگن، وہی میں ہوں، وہی ہے اضطرار
پھر وہی غرفہ، وہی تُو ہے۔۔۔نہیں، تُو اب کہاں
ہو گئی تُو تو کسی گزرے ہوئے پل میں حنوط
اے مری شمعِ دل و دیدہ، مری رختِ قرار
ڈھونڈتی تو ہیں نگاہیں ہر کہیں، تُو اب کہاں

جہانِ دیگر

ہاں بھلا تُو اب کہاں، تجھ کو مری پروا نہ تھی
کوئی پوچھے کہ کسی کی زندگی بننے کے بعد
خشک پتے کی طرح یوں بھی بکھرتا ہے کوئی
کیسے جتلاؤں کہ ایسی بے رُخی زیبا نہ تھی
ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسم کھانے کے بعد
چپ چپیتے قبر میں کیونکر اُترتا ہے کوئی

کوئی دن رہنی ہے یہ غرفے کی جانب ٹکٹکی
کوئی دن تڑپائے گی جو بے دھیانی ہے صنم
پھر بہا لے جائے گا کوئی نگارِ نکتہ سنج
مستقل رہتا نہیں دل میں کبھی غم یا خوشی
مسکراہٹ ہو کہ آنسو سب کہانی ہے صنم
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

وقت بدلے گا مگر اندازِ محبوبی کے ساتھ
میری نظروں کے لئے نا آشنا کچھ بھی نہیں
مسکراہٹ آنسوؤں کا خول پہنے آئے گی
روٹھنے والے ترا پہلو نہیں ہے کل حیات
تُو اگر اُٹھ کر گیا تو کیا ہوا، کچھ بھی نہیں
غمکدۂ دل میں تیری یاد رہنے آئے گی

جمال دیہوگی

اور پھر اک روز تیری یاد کی ٹہنی سے بھی
سر نکالے گی کوئی کونپل نئے عنوان سے
مستقل حالات کی ندی کبھی ٹھہری نہیں
پاسِ ناموسِ وفا اِک وہم کی جادوگری
آدمی آخر نکل آتا ہے ہر بحران سے
مسکراہٹ ہو کہ آنسو، جاوداں کچھ بھی نہیں

جہاں زیب

آ گئے جب سے اُڑانوں کے لئے دو چار پر
معترض ہونے لگے ہم وقت کی رفتار پر

اب تلک سچائیاں نامعتبر ہیں دوستو!
روشنی پھر سے نظر آنے لگی ہے دار پر

خود میں بارودی سرنگیں کیوں بچھا دیتے ہیں ہم
احتیاطِ قلب و جاں میں، ممکنہ یلغار پر

صورتِ رم جھم ہے ہم پر یادِ یارِ مہرباں
گر رہے ہیں برف کے گالے کسی کوہسار پر

زندگانی کا سفر کیسا سفر ہے ہائے ہائے
عمر بھر چلتے رہے ہیں خنجروں کی دھار پر

جہاں دیگر

اپنے چہروں کو بنا لیں حاشیہ تاریخ کا
ثبت کرتے جائیں خود کو وقت کی دیوار پر

آسمانوں کا جگر بھی چیرتا ہو گا ظفرؔ
قہقہہ بندوق کا مرغابیوں کی ڈار پر

جہاں دیگر

سخن ہے آج بہت ناسپاس خوشبو کا
دھوئیں پہ ہونے لگا ہے قیاس خوشبو کا

گلاب سانس کے رستے اُتر گیا مجھ میں
ہوا نے پہنا ہوا تھا لباس خُوشبو کا

خزاں نصیبی چمن کی مشاہدے میں ہے
سمجھ میں کیوں نہیں آتا ہراس خوشبو کا

گئی رُتوں کے فسانے نظر نظر میں پڑھے
روش روش سے ملا اقتباس خُوشبو کا

نفوذ ہو کے وہ یادوں میں آ گیا نہ ہو
گمان ہوتا رہا آس پاس خُوشبو کا

ظفرؔ چمن کو ہے پت جھڑ سے بھی سوا یہ غم
میں تذکرہ نہیں کرتا اُداس خُوشبو کا

جہاں دیگر

کسی آہٹ نے دیئے دل کو دلاسے کیا کیا
وا ہوئے جاتے ہیں آنکھوں کے دریچے کیا کیا

جانے کن خواب ہواؤں کے بھروسے پہ اُڑا
یوں کسی وہم نے پر بھی میرے باندھے کیا کیا

ہر نئے دور میں تحلیل بھی ہوتا رہا میں
یاد بھی آتے رہے مجھ کو زمانے کیا کیا

زخم در زخم نظر آئے اُنہی کے خنجر
اور دیتے رہے احباب دلاسے کیا کیا

ناخدا جانے کہاں راہ میں گم ہوتے گئے
لوگ چلتے ہی رہے اُن کے بھروسے کیا کیا

جہاں دیگر

جو تماشائی بنے ہیں یہ وہی جانتے ہیں
ہر زمانے نے لگائے ہیں تماشے کیا کیا

پھر سے اِک اور مسافت کا بلاوا آیا
سنگِ منزل پہ ملے مجھ کو اشارے کیا کیا

روشنی ایک مسافت کی ہوس لگتی ہے
شبِ تیرہ کو بُلاتے رہے تارے کیا کیا

جہاں دیگر

یہ دور

خود آگاہی کے جس دور میں جیتے ہیں
اُس کی کیا سچائی ہے، معلوم نہیں
کس دلدل سے نکلے تھے، اب یاد کہاں؟
آگے کون سی کھائی ہے، معلوم نہیں

جمال ذکی

کس موج میں اُس خواب نگر جاتا ہوں اکثر
میں خود سے بھی کترا کے گزر جاتا ہوں اکثر

یہ کیسی مسافت مرے پاؤں سے بندھی ہے
منزل ہی نہیں ہے تو کدھر جاتا ہوں اکثر

ادراکِ غمِ ذات کوئی خاک کرے گا
محفل میں تو آ کر میں سنور جاتا ہوں اکثر

یا چاند ستاروں کو سناتا ہوں فسانے
یا شام کے منظر میں بکھر جاتا ہوں اکثر

تنہائی جسے آپ سمجھتے ہیں۔۔۔ وہ کوئی
پاتال ہے، میں جس میں اُتر جاتا ہوں اکثر

جمال زبیر

اُس شہر کی تجسیم میں حصہ ہے مرا بھی
جس شہر سے بادیدۂ تر جاتا ہوں اکثر

رستے میں نظر آئیں گے قطرے مرے خوں کے
دیتا ہوا میں اپنی خبر جاتا ہوں اکثر

تاریکی کا حصہ نہیں بنتا کسی شب بھی
آنکھوں میں لئے خوابِ سحر جاتا ہوں اکثر

جہار دیگ

پھر زقند اُس نے بھری ہے مجھ میں
کوئی دیوار گری ہے مجھ میں

چین لینے نہیں دیتی مجھ کو
ایک آشفتہ سری ہے مجھ میں

ہائے پھر نام ترا سنتے ہی
گونج یہ کیسی اٹھی ہے مجھ میں

اپنے سائے میں ہی ستا لیتا
دھوپ کیوں جاگ رہی ہے مجھ میں

کس قدر مجھ کو کھلائے گی سحر
رات بھر اوس پڑی ہے مجھ میں

جمال ذبیگ

ہاتھ ماتھے سے اٹھا جب تیرا
آگ پھر جلنے لگی ہے مجھ میں

آگہی کیسے تذبذب میں ہے
مستقل جھانک رہی ہے مجھ میں

خود سے کیوں مجھ کو رہائی نہ ملی
کس قیامت کی گھڑی ہے مجھ میں

آئینے چیخ رہے ہیں ناحق
میری اپنی ہی نفی ہے مجھ میں

نامناسب نہیں تیری منطق
پر یہ خفگی جو بھری ہے مجھ میں؟

غمِ جاناں کے علاوہ بھی ظفرؔ
کوئی زنجیر زنی ہے مجھ میں

عدم کے مسافر

عدم کے مسافر پلٹتے نہیں
چلے جائیں تو پھر پلٹتے نہیں
کسی کی بھی خاطر پلٹتے نہیں

ہمہ وقت یادوں کی محفل سجے
ہمیں خوں رلاتے رہیں ہر سمے
مگر بہرِ شاعر پلٹتے نہیں

جنہیں دل سے رخصت نہیں کر سکے
کبھی دل سے ہجرت نہیں کر سکے
وہ پیارے بظاہر پلٹتے نہیں

صدا کوئی اُن کو بلا نہ سکی
اُڑانوں کی مستی میں ہیں آج بھی
کہ مدت سے طائر پلٹتے نہیں

جبارِ دعا

اپنے گھر کو میں اگر بھول گیا
جانے سمتِ سفر بھول گیا

یا تو دشوار تھا شب کا کٹنا
یا تمنائے سحر بھول گیا

حادثے ہوتے رہے پہلے بھی
میں ہی جینے کا ہنر بھول گیا

جانے والے کو خبر بھی نہ ہوئی
کوئی چوکھٹ پہ نظر بھول گیا

ہائے وہ عشق کہ جس میں خود کو
یاد رکھنا تھا مگر بھول گیا

جہاں دیگر

پھر سمندر نے بلایا ہے مجھے
اور میں رنگِ بھنور بھول گیا

دُور جھیلوں کی تمنا نہ گئی
اپنے ٹوٹے ہوئے پر بھول گیا

پھر اُسی دشمنِ جاں کا ہے خیال
زخمِ دل، سوزِ جگر بھول گیا

کھا گیا کیسا دھندلکا مجھ کو
جانے کیا کیا میں ظفرؔ بھول گیا

یوں منزل کا کوئی رستہ نہیں تھا
بھٹکنے کا مگر سوچا نہیں تھا

مری پوروں میں کیسی لو سی جاگی
ابھی وہ نام بھی لکھا نہیں تھا

زمین و آسماں کھو بیٹھتا میں
اندھیرا اِس قدر گہرا نہیں تھا

میں خود سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن
در و دیوار میں رستہ نہیں تھا

عجب تھی اُس کی بزمِ ناسپاساں
وہاں یوں تھا کہ میں گویا نہیں تھا

ہمارے حوصلوں نے جب بھی دیکھا
کوئی بھی آسماں اونچا نہیں تھا

جہاں زیب

سرینگر!

بپا ہے کیا بلا کا رن ---- دمن دمن
چنار بھی ہیں شعلہ زن
یہ تن بدن ترا ہی دھن --- مرے وطن
یہی لگن ہے موجزن
فدا ہوں تیرے نام پر
سرینگر!
سرینگر!

یہ سربریدہ نوجواں --- یہ سخت جاں
بہار کی ہیں سرخیاں
یہ آنچلوں کی دھجیاں --- علم نشاں
حیاتِ نو کی داستاں
ہمہ بشارتِ ظفر
سرینگر!
سرینگر!

مجاہدوں کے قافلے --- جدھر چلے
لہو کے راستے بچھے
اذیتوں کے خوف سے --- کبھی رُکے
نہ پھانسیوں سے ہی ڈرے
تری ضیاء نظر نظر
سرینگر!
سرینگر!

حسرتِ دید سرِ دیدۂ مضطر ٹھہری
موسمِ گُل کی سواری کہاں جا کر ٹھہری

عمرِ رفتہ کہ سفینۂ شکستہ ہے کوئی
اور طوفان کہ ہر موج سمندر ٹھہری

ہم مسافر کی طرح آتے گئے جاتے گئے
زندگی جیسے کرائے کا کوئی گھر ٹھہری

کس کو پروانۂ تعمیر ملے گا آخر
میری فائل بھی اگر داخلِ دفتر ٹھہری

تو وہ پتھر کبھی دل کی طرح کیوں نہ دھڑکا
جب محبت کبھی مرہم کبھی خنجر ٹھہری

عمر گزری فنِ سرکوبیٔ قلزم میں مگر
موجِ پایاب ہی آ کر مرے سر پر ٹھہری

جہاں دیدؔ

بند ہر راستہ نہیں ہوتا
ہر سفر دائرہ نہیں ہوتا

یوں تو ترکِ وفا نہیں دشوار
بس ہمیں حوصلہ نہیں ہوتا

دل کے رشتوں کو ٹوٹنے مت دو
فاصلہ فاصلہ نہیں ہوتا

جو میسر ہو انبساط کے بعد
درد بے ذائقہ نہیں ہوتا

یہ اُترتا نہیں ہے وقت کے ساتھ
عشق کوئی نشہ نہیں ہوتا

لاکھ بہروپ بھر کے آئے جھوٹ
روکشِ آئینہ نہیں ہوتا

خوش گمانی ہو تیرے باب میں کیا
اب کوئی معجزہ نہیں ہوتا

جانتا ہوں غمِ حیات کو میں
حاصلِ قہقہہ نہیں ہوتا

دوستانہ مشورہ

پسینے کا چکا دیں محنتانہ
لہو کے قرض پلے پڑ نہ جائیں
جو حق مزدور کا ہے اُس کو دے دیں
کہیں لینے کے دینے پڑ نہ جائیں

کشمیر

چل دیا ہے منزلوں کو قافلہ کشمیر کا
رہرؤں سے بھر گیا ہے راستہ کشمیر کا

یہ گزرتے پل نہیں تاریخ کے صفحات ہیں
خوں سے لکھا جا رہا ہے واقعہ کشمیر کا

ظلم کے لاوے سے جو بھرتے ہی جاتے ہیں اسے
ایک دن جا لے گا اُن کو دائرہ کشمیر کا

بچہ بچہ ہے لہو کی موج میں آیا ہوا
ساری وادی میں بپا ہے معرکہ کشمیر کا

اب بساطِ دہر پر ہر چال خود اپنی چلیں
اپنے جذبوں سے بنالیں زائچہ کشمیر کا

کوئی بھی چشمہ کسی کہسار سے رکتا نہیں
اپنی سرمستی میں ہے ہر زمزمہ کشمیر کا

کور چشمی ہے زمانے کی وگرنہ دوستو!
مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے مسئلہ کشمیر کا

کاش کھل جائیں سبھی رستے دلوں کے درمیاں
سبز نقشے میں ڈھلے جغرافیہ کشمیر کا

یہ جہاں کے چوہدری تو اندھے بہرے ہیں ظفرؔ
اہلیانِ دل اُٹھا لیں تعزیہ کشمیر کا

ثمر آور نہیں ہے دوستی کیا
اِسے بھی وقت کی دیمک لگی کیا

دلیلِ زندگی کیوں دے رہے ہو!
مقدمے سے بھی ہونا ہے بری کیا

کچل کر خود کو آگے بڑھ رہے ہو
یہی رستہ بچا ہے آخری کیا

یہ سمجھایا نہیں جا سکتا تم کو
کنارِ آبجو ہے تشنگی کیا

سرِ راہے کوئی غرفہ نہیں تھا
صبا کا ہاتھ خوشبو تھامتی کیا

مسافت کے جنوں میں سُن نہ پایا
بتاتی رہ گئی تھی آگہی کیا

سخن میں بھی تھے سناٹے بلا کے
ہماری خامشی پھر بولتی کیا

بھنور سے بچ کے ساحل پر جو آتا
تو پھر کشتی مری نہ ڈوبتی کیا؟

رہن میں رکھ لیا ہے بادلوں نے
سحر ہے تعزیۂ روشنی کیا

کسی کی اپنی مقناطیسیت تھی
بھلا ہم کیا ہماری عاشقی کیا

ظفرؔ نظریں چراتا ہوں میں خود سے
دکھائے گی تماشہ بے بسی کیا

اُس کی یادوں میں دفنایا جا سکتا ہے
خود کو ایک مزار بنایا جا سکتا ہے

دل میں کسی کا پیار بسا رکھا ہے ہم نے
رحل میں یہ قرآن سجایا جا سکتا ہے

تیرہ شبی کی بیخ کنی ناممکن بھی ہو
کم از کم اِک دیا جلایا جا سکتا ہے

لوگ اگر تسخیر نہ ہو پائیں تو کیا ہے
قلعے پہ جھنڈا تو لہرایا جا سکتا ہے

جو بیدار ہیں اُن کو ہوش میں لائیں کیسے؟
جو سوتے ہیں اُنہیں جگایا جا سکتا ہے

جہاں دیگر

دل کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے اکثر
اپنے آپ کو بھی الجھایا جا سکتا ہے

مشتِ خاک سہی پر اپنے حق کی خاطر
طوفانوں سے بھی ٹکرایا جا سکتا ہے

آنکلا ہے جنگل کو اک بھوت ہوس کا
لے کر ہر اک پیڑ کا سایہ جا سکتا ہے

دل کی بے رنگی کا افسانہ کہہ سُن کر
محفل میں اِک رنگ جمایا جا سکتا ہے

جس زمانے میں ہوا علمِ جہالت کم کم
باندھی جانے لگی دستارِ فضیلت کم کم

میرے کردار سے تفہیمِ فسانہ کیا ہو
اِس میں تفصیل زیادہ ہے وضاحت کم کم

زندہ رہنا ہے بہرحال اِسی دنیا میں
زندہ رہنے کی اگرچہ ہے سہولت کم کم

آسماں سے بھی ہے کچھ بیر خدا واسطے کا
اور چھت بھی تو سروں پر ہے سلامت کم کم

غمِ ہستی نے بھی چھوڑا نہ ہمارا دامن
مسکرانے کی بھی ہم کو رہی عادت کم کم

جمال ذبیح

آکسیجن کی طرح تھا جو مرے جیون میں
اب اُسی نام سے بھی مجھ کو ہے نسبت کم کم

ہول آتا ہے چراغوں سے مرے لوگوں کو
آزماتی ہے نئے دور کی ظلمت کم کم

اِسی باعث ہمیں جینے کا ہنر نہ آیا
شہر میں رزق تو وافر تھا محبت کم کم

اژدھے اپنی زبانوں میں ہیں پالے ہم نے
آسمانوں سے اُترتی ہے مصیبت کم کم

پہیہ چلے

(یومِ مئی کے حوالے سے ایک نظم)

تھک گئے ہیں کچھ مسافر زندگی کرتے ہوئے
زندگی کے نام پر جیتے ہوئے، مرتے ہوئے
وقت کی چونگی پہ یوں محصولِ جاں بھرتے ہوئے

ہر طرف محنت کشوں کا غلغلہ تو ہے بہت
دن منانا ہے سو اِن کا تذکرہ تو ہے بہت
زندگی اِن کی ہنوز اِک مسئلہ تو ہے بہت

وقت کی تحریر ہے اِن کے پسینے سے جلی
ارتقا کی فیکٹری اِن کی مشقت سے چلی
ان کی محنت تھی کہ حرفت اس قدر پھولی پھلی

اس قدر ہر دور کی صورت گری میں کھو گئے
اپنے خدو خال گردِ مفلسی میں کھو گئے
سرخوشی سب کی بنے، خود بے کسی میں کھو گئے

بندۂ مزدور کیوں دادِ وفا پاتا نہیں
جیسی محنت کرتا ہے ویسی جزا پاتا نہیں
آئینہ اِن سے نظر بھی اب ملا پاتا نہیں

وقت ہے کہ درد کے متوالوں کا پہیہ چلے
زندگی کے سارے خستہ حالوں کا پہیہ چلے
اب ذرا پہیہ چلانے والوں کا پہیہ چلے

جہاز بگ

اِک داغِ ہجر یوں دلِ مضطر میں پڑ گیا
جیسے کوئی شگاف سمندر میں پڑ گیا

دیکھا ہے کس نظر سے کہ دھندلا گیا ہوں میں
کیسا یہ قُفل اُس کے کھلے در میں پڑ گیا

جب بھی مری مہارتیں ناوک فگن ہوئیں
دیکھا ہدف تو میرے ہی پیکر میں پڑ گیا

اِک آگہی تھی جس نے مجھے سونے نہیں دیا
اِک درد تھا جو دل کے شناور میں پڑ گیا

کام آ سکا نہ میری اُڑانوں کا بانکپن
یونہی میں خودبخود کسی منظر میں پڑ گیا

جہاز بیگ

کس لمس کے گلاب نے یوں گدگدا دیا
اِک دھڑکنوں کا سلسلہ پتھر میں پڑ گیا

اِک خواب تھا جو نیندیں اُڑا لے گیا ظفرؔ
اِک لمحہ تھا جو عرصۂ محشر میں پڑ گیا

جہان دیگر

کردار ہمارے بھی فسانے کے عجب ہیں
وہ قتل بھی کرتے ہیں جو جینے کا سبب ہیں

مل جائیں گی خوشیاں بھی یونہی تم کو کسی دن
کیا غم ہے مقدر میں اگر رنج و تعب ہیں

کیا خاک علم لے کے سحر کا کوئی نکلے
جو دن کے مسافر تھے سرِ خیمۂ شب ہیں

کچھ شہر کے آداب موافق نہیں اب کے
کچھ آپ کے دیوانے بھی زنجیر طلب ہیں

تب بھی مری ہر سانس ترے نام لکھی تھی
اب کے بھی شب و روز پہ یادوں کے نقب ہیں

جہاں‌ دیگر

یہ دیکھ کے بھی صبر مجھے آتا نہیں ہے
جو میرے نہیں ہو سکے اپنے بھی وہ کب ہیں

کس دور میں ہم اہلِ جنوں پیدا ہوئے ہیں
انداز ہیں جینے کے نہ مرنے کے ہی ڈھب ہیں

چپ چاپ سبھی قتل ہوئے جاتے ہیں اب کے
کچھ دیکھتی آنکھیں ہیں نہ کچھ بولتے لب ہیں

درد با وصفِ شکیبائی چھلک جاتا ہے
کوئی آنسو میری پلکوں سے ڈھلک جاتا ہے

خامشی پہنی تھی اوروں سے زیادہ میں نے
دیکھنے والوں کا کیوں مجھ پہ ہی شک جاتا ہے

دل کے آوازے کو زنجیر بھی پہنا دیکھی
یہ مگر صورتِ پازیب چھنک جاتا ہے

کبھی رہنے نہیں دیتا ہے تہی دست مجھے
جو بھی آتا ہے کوئی دے کے کسک جاتا ہے

بددعا سی ہے مسافر کو کسی کی شائد
پاس آ جاتی ہے منزل تو بھٹک جاتا ہے

جہاں دیدہ

جب کبھی دل میں تری یاد کی لو جاگتی ہے
میرے اندر کوئی بچہ سا ہمک جاتا ہے

کالے کوسوں کے مسافر کو سکوں خاک ملے
اپنی جانب بھی تو چلتے ہوئے تھک جاتا ہے

تشنگی روح کی بجھتے نہیں دیکھی ہے کبھی
ویسے جانے کو تو لب جام تلک جاتا ہے

اس کو پاتال میں گرتے ہوئے بھی دیکھا ہے
یہ زمیں زاد جہاں تابہ فلک جاتا ہے

پاکستان

نالۂ شبگیر کی تاثیر پاکستان ہے
کتنی صدیوں بعد اِک تنویر پاکستان ہے

پیار کرنے والوں کا اِک دیس ہے میرا وطن
مہرباں ہاتھوں کی اِک زنجیر پاکستان ہے

میری ہر اُمید کی تمہید اس کے نام سے
میرے ہر اِک خواب کی تعبیر پاکستان ہے

میرا ماضی، حال، مستقبل، سبھی کچھ ہے یہی
میری ساری عمر کی جاگیر پاکستان ہے

کوئی بھی خطہ کہاں آغوشِ مادر کی طرح
میں جہاں جاؤں مری تقدیر پاکستان ہے

دل ہے پاکستان میں تو تم ہو پاکستان میں
نقشۂ عالم کی ہر تصویر پاکستان ہے

جمیل الدین عالی

تم اگر دنیا میں اس کی آبرو بن کر رہو
تو جہاں میں باعثِ توقیر پاکستان ہے

نظریۂ کا نام ہے یہ، قطعۂ ارضی نہیں
جس جگہ ہو نعرۂ تکبیر پاکستان ہے

کلمہ گو لوگوں کو مل جائے کوئی جائے اماں
بس یہی اِک حسرتِ تعمیر پاکستان ہے

دیوِ استبداد کے پنجے میں ہے یوں تو پری
دِل سے دیکھا جائے تو کشمیر پاکستان ہے

خندقِ اوّل ہے دہشت گردیوں کے سامنے
امنِ عالم کی نئی تفسیر پاکستان ہے

اِس لئے بھی رُک گئی ہیں ظالموں کی یورشیں
ایک لہراتی ہوئی شمشیر پاکستان ہے

صفحۂ عالم سے اِس کو کیا مٹائے گا عدو
خون سے لکھی ہوئی تحریر پاکستان ہے

اپنی بات

اوروں سے تو رشتے ناتے گنجلا جاتے ہیں
جیون خوب گزر جاتا ہے اپنے ساتھ یقیناً
اوروں کو سمجھانا خاصا مشکل ہوتا ہے
بندہ آپ سمجھ لیتا ہے اپنی بات یقیناً

جبار زیبا

شہر بھر میں کیوں اُس کی ہم نے جستجو کی تھی
وہ ستمگر کہ جس کی ہر ادا عدو کی تھی

دل ہی بجھ گیا تھا پھر دیکھتا اُسے میں کیا
اُس نے اپنی خوشبو تو میرے چار سو کی تھی

کیسا زخم تھا کہ جو مندمل نہ ہو پایا
موت کے ہی ٹانکے سے زندگی رفو کی تھی

وہ جو دستِ ساقی میں تھیں، وہ ساری شمعیں تھیں
وہ جو ہر طرف تھی، وہ روشنی سبو کی تھی

سب شجر گلستاں کے جھاڑ بیٹھے تھے دامن
ہائے کیسے موسم میں آرزو نمو کی تھی

یوں خبر تو دلدل کی مل گئی تھی رستے میں
ہم نہ لوٹ کر آئے بات آبرو کی تھی

جہاز دیگا

کیسا دورِ جانکاری تھا کہ جس پر نازاں تھے
تھا وجدان بھی تشنہ، آگہی بھی بھوکی تھی

دیکھئے نصیبوں کو، چھوڑئے اِن باتوں کو
کس کو ہم نے پایا ہے کس کی آرزو کی تھی

زعمِ ضبط تھا ہم کو سو نظر نہیں آئی
جو پلک سے الجھی تھی بوند اِک لہو کی تھی

آج شام محفل میں جانے کتنے لوگوں سے
ہم نے بات کی تھی یا خود سے گفتگو کی تھی

وصل کی کوئی خوشبو میں پہن کر نہ آیا
"حرف حرف گوندھے تھے طرز مشکبو کی تھی"

آج کیسی یادوں کی بارشوں میں بھیگا ہوں
آج کیسا غوغا ہے بات تو کبھو کی تھی

یادوں سے نمٹنے کی یوں تیاری کروں گا
میں اُس کو بھلانے کی اداکاری کروں گا

کچھ بن نہ پڑے گا جو محبت کے سفر میں
دوراہے سے رستے کی خریداری کروں گا

تم اس کا بنا لینا بڑے شوق سے ایندھن
ہے کام مرا سو میں شجرکاری کروں گا

جب چوٹ لگاؤں گا کسی یاد کی دل کو
امید ہے خود اپنی بھی غمخواری کروں گا

تم آج جہاں سوختہ تن، تشنہ دہن ہو
اک نہر اسی دشت سے میں جاری کروں گا

جہاں زیب

یہ دل ہے کسی اور کا مقبوضہ علاقہ
کرنے کو تو دعویٰ عملداری کروں گا

منزل پہ پہنچ کر بھی سکوں مل نہ سکے گا
اک اگلی مسافت کی میں تیاری کروں گا

آواز نہ بھر پایا اگر جامِ نوا میں
میں سوزِ خموشی میں عزاداری کروں گا

وہ بات کھلے عام جو کرنے کی نہیں ہے
محفل میں جب آئے گی مری باری، کروں گا

اُف یہ یادیں

میں کتبہ ہوں گزری ہوئی ساعتوں کا
جو گاڑا گیا ہے ہر اِک راستے پر
میں نوحہ ہوں بھولی ہوئی صحبتوں کا
جو لیتا ہے سانس آج بھی میرے اندر

میں جو بات کرتا ہوں اُس میں وہ بولے
میں جو لفظ لکھتا ہوں اس میں وہ چیخے

مری زندگی میں بڑے موڑ آئے
عجب سرگرانی میں چلتا رہا ہوں
بہر گام رستہ بدلتا رہا ہوں
بدلتا رہا ہوں میں گو اپنا رستہ
مگر جب کبھی میں نے دیکھا پلٹ کر
تو آیا ہے مجھ کو نظر سیدھا رستہ

وہ ماضی تھا یہ حال ہے، مانتا ہوں
مگر خود کو کیسے یہ بتلا سکوں گا
میں یادوں سے بچ کر کہاں جا سکوں گا

جہانِ دیگر

لگتی ہے یوں تو اِن دنوں خنجر کی دھار چپ
لیکن کسی کے مان کی ہے پردہ دار چپ

یہ تو ہماری روح کی خود رو سی فصل ہے
کب دیکھتی ہے رنگِ خزاں و بہار چپ

لب بستگی اور آپ کی محفل میں، حشر ہے
پر لے کے آ گیا ہوں کسی سے اُدھار چپ

کتنے ہی حادثات کی رُوداد سا بنا
کب سے ہے کوئی صورتِ سنگِ مزار چپ

اک آگہی کا ناگ تھا، ڈستا چلا گیا
خوش فہمیاں نہ دے سکی بے اعتبار چپ

جہانزیب

چپ رہنا جس مقام پہ جرمِ ضمیر ہو
رکھے وہاں پہ کیسے کوئی برقرار چپ

کب سے میں آزمائشِ قلب ونظر میں ہوں
چبھتی ہے میرے دل کو تری خار خار چپ

دل تو ہمکتا رہ گیا اُس کی نگاہ سے
لیکن لبوں پہ جم گئی اِک زرنگار چپ

کشکولِ جاں میں ڈال دے قربت کی سرخوشی
اے دوست اپنی ذات سے کچھ تو اُتار چپ

گم ہوں اکیلگی کے عجب شور میں ظفرؔ
پچھلے کئی دنوں سے بنی آبشار چپ

جہاں دیگر

دُھند میں کھوئی ڈگر کو دیکھیے
پھر کسی حکمِ سفر کو دیکھیے

باندھیے امید پھر سے باندھیے
پھر سے یارانِ سفر کو دیکھیے

اِس کی ٹھنڈی چھاؤں میں ستائیے
دُھوپ میں جلتے شجر کو دیکھیے

برسرِ ساحل ہے سیلفی کی طرح
سیپ اور اس کے گہر کو دیکھیے

دُور اِتنا بھی نہیں ہے آسماں
حوصلۂ بال و پر کو دیکھیے

حُسن بھی زندہ حقیقت ہے ظفرؔ
پر مرے حُسنِ نظر کو دیکھیے

تشنگی کم نہیں تاہم مرا دل کہتا ہے
ابر برسے گا چھا چھم، مرا دل کہتا ہے

گاڑ سکتا ہوں ترے دل کے قلعے پر اِک دن
اپنی آواز کا پرچم، مرا دل کہتا ہے

سب مسائل کی گرہیں کھول کے رکھ دیتی ہیں
جب بھی مل بیٹھیں گے باہم، مرا دل کہتا ہے

آنے والے کسی طوفاں کی خبر دیتی ہیں
دھڑکنیں وقت کی مدھم، مرا دل کہتا ہے

تھوڑی حالات کی مشاطگی کرنی ہو گی
زلف رہنی نہیں برہم، مرا دل کہتا ہے

جہاں دیگر

یہ فضاؤں میں جمی برف پگھل جائے گی
اب بدل جائے گا موسم مرا، دل کہتا ہے

رنگ لائے گی مرے خوابِ سحر کی کاوش
نہ رہے گی یہ شبِ غم، مرا دل کہتا ہے

رُوئے گلزار کو ہیرے کی چمک بخشے گی
میری آنکھوں کی یہ شبنم، مرا دل کہتا ہے

دعوۂ ترکِ مراسم پہ وہ قائم ہی سہی
مجھ کو بھولا نہیں تادم، مرا دل کہتا ہے

جہاں زیب

اندھیروں میں کھڑا ہوں، سوچتا ہوں
میں کس گھر کا دیا ہوں، سوچتا ہوں

زمانے بھر کی نظریں پھر گئی ہیں
میں کتنا بے وفا ہوں؟ سوچتا ہوں

یونہی بیکار تو لکھا نہ ہو گا
جو لکھ کر کاٹتا ہوں، سوچتا ہوں

وہ مجھ کو بھول بھی سکتا ہے شائد
جگر کو تھامتا ہوں، سوچتا ہوں

بھنور نے لا کے پھینکا ہے کہاں پر
کنارے سے لگا ہوں، سوچتا ہوں

گزرتا جا رہا ہے سر سے پانی
میں ہوں کہ سوچتا ہوں سوچتا ہوں

بہت شکوے گلے کرنے چلا تھا
مگر رُک سا گیا ہوں، سوچتا ہوں

جبار رضا

میرے بیٹے

میرے بیٹے میں کچھ بھی نہیں
تو مرے واسطے ایک لعلِ ثمیں
ہاں مگر جب پکارے وطن کی زمیں
میرے بیٹے تری ذات کچھ بھی نہیں
اس سے بڑھ کر نہ ہوں میں تمہارے لئے
اور نہ میری نگاہوں میں وقعت تری

میرے بیٹے! مرے چاند!! میرے جگر
تیری وقعت اگر ہے تو بس ہے یہی
جب وطن کو ضرورت پڑے
تیرے تن میں کوئی قطرۂ خوں نہ باقی بچے
اس کی حرمت پہ تو کٹ مرے
اس کے ماتھے کا جھومر بنے

جہادِ جگر

حبس کا عالم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے
گریۂ پیہم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

خشک پتے سرسراتے ہیں مرے اندر کہیں
ہاتھ میں البم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

زندگی بھر کی گھٹن کا کچھ مداوا تو کرے
وقت سا محرم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

آخرِ شب کے سفر میں کیا خبر کب ہو سحر
سانس کچھ مدھم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

روح سے کھرچی نہیں جاتیں خزاؤں کی تہیں
فصلِ گل کا غم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

یہ فضا گویا مرے سوزِ دروں میں ڈھل گئی
دور تک شبنم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

خشک سالی سے تو سمجھوتے کا میں قائل نہیں
آرزو کا نم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

پہنتا ہوں کیسے خوابوں کی گلابی عینکیں
عنبریں موسم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

آکسیجن مسکراہٹ کی اتارو بھی ظفرؔ
وقفۂ ماتم ہے اور بادِ صبا کی بات ہے

ڈور جاتے ہوئے قدموں کی نوا میں گُم ہوں
جانے کب سے کسی صدمے کی فضا میں گُم ہوں

تیری تصویر کہ باتیں کئے جائے مجھ سے
اور میں ہوں کہ کسی چُپ کی گُپھا میں گُم ہوں

اپنی پہچان کی منزل نہیں آئی اب تک
میں کہ خوشبو کی طرح بادِ صبا میں گُم ہوں

پی لیا جس نے مرے چین کو سگریٹ کی طرح
ہائے اب بھی اُنہیں گلیوں کی ہوا میں گُم ہوں

اپنے ہونے کی خبر ہے نہ زمانے کا پتہ
ایک مدت سے مگر کُن کی صدا میں گُم ہوں

تیرے خوابوں نے مجھے چھین لیا تھا کل بھی
آج بھی دور بہت دور خلا میں گُم ہوں

اب میں کیا خاک کروں سمتِ سفر کو موزوں
عمرِ رفتہ کی کسی لغزشِ پا میں گُم ہوں

جہانزیب

نکلے تھے ہم جہانِ دگر کی تلاش میں
بھٹکے ہوئے ہیں سمتِ سفر کی تلاش میں

کیوں واہموں نے تھامے ہوئے ہیں مرے قدم
جب خواب چل پڑے ہیں سحر کی تلاش میں

کیا سوچتے ہو فردا نژادوں کے شہر میں
کیا دیکھتے ہو اہلِ نظر کی تلاش میں

یوں ایک ثانیئے کے بھنور نے نگل لیا
جیسے رہے ہوں ہم اِسی شر کی تلاش میں

منزل پہ بھی ہے فکرِ مسافت اُسی طرح
پھر سے نکلنا ہے ہمیں گھر کی تلاش میں

سائے سے رنگ و نور کا فیضان ہے عبث
حاصل حصول کیا ہے بشر کی تلاش میں

منزل نہیں ہو راہ کے اِک سنگِ میل ہو
جانے بھی دو ظفرؔ کو ظفرؔ کی تلاش میں

ہمیشہ مضطرب موجوں کو رکھا ہے سمندر نے
سفر کا استعارہ بن کے رہنا ہے سمندر نے

مری خوشیوں کے مول اُس نے خریدا ہے نشہ اپنا
مرے ہر چاند کو خود میں ڈبویا ہے سمندر نے

عجب طوفانِ غراں ہے بپا ہر فردِ خانہ میں
اِسی دالان سے جیسے گزرنا ہے سمندر نے

یہ مشتِ خاک نے پوچھا ہے اکثر موج میں آ کر
کوئی طوفان مجھ جیسا بھی دیکھا ہے سمندر نے

میں اپنے آپ سے بچ کر کہیں بھی جا نہیں سکتا
مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے سمندر نے

جہاں زیب

کوئی باہر نکلتا ہی نہیں اپنے جزیرے سے
اِسی باعث تو اِتنا سر اٹھایا ہے سمندر نے

کسی کا نام چھیدے جا رہا ہوں کس بھروسے پر
مرا ریگِ بدن جب نوچ لیتا ہے سمندر نے

اِدھر ہم ہیں گریزاں اپنے موجۂ لہو سے بھی
اُدھر گرداب کو سینے پہ لادا ہے سمندر نے

جہانِ دیگر

پچھتاوہ

اب تو میں دور۔۔۔بہت دور نکل آیا ہوں

میں نے جس جادۂ ہستی پہ قدم رکھا تھا
جانے کس موڑ پہ وہ ساتھ مرا چھوڑ گیا
خواب جو لے کے چلا تھا مجھے سوئے منزل
کسی بچے کی طرح ہاتھ مرا چھوڑ گیا

جانے کس وقت دھندلکے نے چرایا ہے مجھے
جانے کس ساعتِ اژدر نے مجھے نگلا ہے
خود کو میں اپنے اِرادوں میں بہت ڈھونڈتا ہوں
اپنے کھو جانے کا احساس بہت رہتا ہے

جہانِ دیگر

وقت گرداب کی صورت ہے مرے پاؤں میں
کسی تنکے کی طرح بہتا چلا جاتا ہوں
میرے قدموں کو ٹھہرنے کی اجازت ہی نہیں
کس کو معلوم میں کس سمت اڑا جاتا ہوں

نہ کوئی چاند' نہ جگنو نہ تمہارا چہرہ
ظلمتِ شب مرا مقدور نظر آتی ہے
جب بھی دیکھا ہے پلٹ کر یونہی چلتے چلتے
روشنی دُور۔۔۔بہت دُور نظر آتی ہے

اب تو میں دُور۔۔۔ بہت دور نکل آیا ہوں

جبار دلگیر

یوں تیرے چکر میں گم ہوں
تو موجود مگر میں گم ہوں

اِک آسیب ہے جسم و جاں میں
اِک بے نام بھنور میں گم ہوں

کس کی گونج ہے میرے اندر
کس کے روپ نگر میں گم ہوں

ساری دنیا پڑی ہوئی ہے
میں کیوں اِک منظر میں گم ہوں

جیون ایک تہی ساغر ہے
اور اس کے اندر میں گم ہوں

پھر اندھیرے نور کا دھوکہ پہن کر آئیں گے
آگہی جب کانچ کا بُت ہے تو پتھر آئیں گے

کٹ کے آنگن میں گری کیسی نگاہوں کی پتنگ
لوٹنے والی تمناؤں کو چکر آئیں گے

یہ جو کہساروں کی پھسلن ہے کہیں بہہ جائے گی
دیکھنا اِک روز ہم چوٹی کو چھو کر آئیں گے

موسموں نے جب بھی پہنی ہیں گلابی مہندیاں
کیوں گماں ہوتا ہے کہ طوفان ہی گھر آئیں گے

پانیوں کے شور غراتے ہی رہ جائیں گے اور
ہم ندی پر سے گزر جائیں گے اوپر آئیں گے

اسمِ اعظم سے زبانوں کا ہنر کھلنے تو دو
طاقتوں کے دیوتا معبد سے باہر آئیں گے

جبار جمیل

غمِ ہستی کے عنواں بانٹ دوں گا
یہ اوراقِ پریشاں بانٹ دوں گا

مرے نزدیک خوشیاں ہیں امانت
اُلٹ دوں گا میں داماں بانٹ دوں گا

تھما دوں گا دیے سب کو چمن میں
نئے موسم کے ارماں بانٹ دوں گا

مری مشکل بڑھاتی جائے دنیا
میں اس کو کر کے آساں بانٹ دوں گا

کسی منظر کو دھندلانے نہ دوں گا
میں اپنا سب چراغاں بانٹ دوں گا

جمال دہلوی

صبا کی ایک تھپکی مل گئی تو
بہارِ نو کے عنواں بانٹ دوں گا

بکھر جاؤں گا میں چہرہ بہ چہرہ
جو مجھ میں ہے وہ انساں بانٹ دوں گا

خزاں کو گھیر لوں گا ہر طرف سے
ظفرؔ خوابِ بہاراں بانٹ دوں گا

جہاں دیگر

میرے ڈر میں سانپ ہیں
یا نگر میں سانپ ہیں

بستیاں ہیں سانپ گھر
ہر نظر میں سانپ ہیں

سب اُٹھا لیں بانسری
سب کے گھر میں سانپ ہیں

جنگلوں کا ڈر بجا
بام و در میں سانپ ہیں

کس کے سائے میں اماں
ہر شجر میں سانپ ہیں

جمال ذیب

منزلیں ہیں جس طرف
اُس ڈگر میں سانپ ہیں

دوستی بہروپ ہے
ہر بشر میں سانپ ہیں

ہم سپیروں کے لئے
شہر بھر میں سانپ ہیں

جہانِ دیگر

ایک سوال

چلو اچھا ہوا تم نے
سرِ دشتِ تمنا آگہی کا راستہ تو کھینچ ڈالا ہے
عذابِ بے یقینی سے نکالا ہے
چلو پھر از سرِ نو میں سفر آغاز کرتا ہوں
مگر اے خضرِ راہ میرے
بہت احسان ہوتا جو مجھے یہ بھی بتا دیتے
کہ یہ جو عمر بھر چلتا رہا ہوں میں
اِسے بھی میں سفر کے باب میں لکھوں کہ نہ لکھوں؟

روح کے اندر تھے سناٹے بہت
ہم حصارِ ذات میں گونجے بہت

موج کو کشتی بنا پائے نہیں
وقت کے گرداب سے الجھے بہت

کون سی منزل رہی پیشِ نظر
یہ قدم چلتے رہے الٹے بہت

ساحلِ ہستی کی گیلی ریت پر
زائچے طوفان نے کھینچے بہت

آس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے
ہجر کے کچھ کوس تھے لمبے بہت

درد کا سیلاب اُترا ہی نہیں
ہم مگر ڈوبے بہت ابھرے بہت

اس قدر سفاک تھی بوٹوں کی چاپ
خشک پتے خاک ہو جاتے بہت

دستکیں تھیں جانی پہچانی ہوئی
دل مقفل ہو کے بھی دھڑکے بہت

اپنے ہی قدموں میں آ کر گر پڑے
تھے ہمارے خواب تو اونچے بہت

آنکھوں کو کسی خواب کا تحفہ نہیں ملتا
اِس راکھ میں خفتہ کوئی شعلہ نہیں ملتا

پھرتا ہوں ترے ہجر کی تاریک گلی میں
وہ پل جسے بنتا تھا ستارہ، نہیں ملتا

کس خامۂ دوراں نے لکھا تیرا فسانہ
جس میں تھا مرا ذکر وہ حصہ نہیں ملتا

میں ایسے سفر پر بھی نکل پڑتا ہوں اکثر
جو میرے مقدر میں نوشتہ نہیں ملتا

کیا جانے مرا قتل ہوا ہے کہ نہیں ہے
ملتا ہے لہو ، کوئی وقوعہ نہیں ملتا

جمال دیوا

ناموسِ محبت میں جو رسوا نہ ہوا ہو
اُس شخص کو جینے کا قرینہ نہیں ملتا

ہر شخص تماشائی ہے، ہر شخص تماشہ
آنکھوں کو مگر ذوقِ تماشہ نہیں ملتا

ہاں عہدِ دگر کہ مجھے اِس پر بھی ہے باور
اب تیرے سخن سے ترا لہجہ نہیں ملتا

مل جاتا ہے روکے ہوئے راہ تیری گلی کی
اور ڈھونڈنے نکلیں تو زمانہ نہیں ملتا

اب ترکِ تعلق کا ارادہ جو کیا ہے
مجھ کو در و دیوار میں رستہ نہیں ملتا

جہاں دیگر

برفاب رُت میں ہم ہی نہیں تھے جمے ہوئے
انگارے شہر بھر کے وہیں تھے جمے ہوئے

نکلا نہیں غنیم کسی مورچے سے بھی
اپنے مقابلے میں ہمیں تھے جمے ہوئے

تاریخ کہہ رہی ہے لڑی ہی نہیں گئی
وہ جنگ جس میں اہلِ یقیں تھے جمے ہوئے

بارش نہیں تھی ہجر میں روئے تھے رات بھر
آنسو نہیں تھے لعلِ ثمیں تھے جمے ہوئے

کیوں ہم کو اپنے چاند ستاروں کی کھوج تھی
جب آسمان زیرِ زمیں تھے جمے ہوئے

جمار دیگا

آجراجیر

خدا جانے کہ سارے مالکوں کو
دکھائی دیتے ہیں کیوں شُوم مزدور
لگا دیتے ہیں اس مد میں کروڑوں
کہ لاکھوں سے رہیں محروم مزدور

اگر فرمائے جانا ہے یونہی مجھ پر کرم اکثر
ہمارے صبر سے رکھے توقع وہ بھی کم اکثر

ہماری آبلہ پائی کو کتنے خار بخشے گی
دھنک سی جو نظر آتی ہے یہ زیرِ قدم اکثر

ہمیشہ ہم نے جن کے نام اپنی ہر خوشی کی ہے
نجانے کیوں اُسی کے نام پر ملتے ہیں غم اکثر

تری اِتنی بہت سی گفتگو سے بھی نہیں کھلتا
بتا دیتا ہے جو ہم کو تری پلکوں کا خم اکثر

ہماری روح میں جیسے دفیں سی بجنے لگتی ہیں
بلاتا ہے ہمیں اپنی طرف خوابِ عدم اکثر

جہاں دیگر

کبھی ذوقِ سفر نہ مل سکا اِس آگہی پر بھی
ہمیں رستے ملے منزل کو جانے والے کم اکثر

یوں سارے شہر کی گلیاں اُداسی سے بھری کب تھیں
اکیلے رہ چکے ہیں آپ سے پہلے بھی ہم اکثر

ظفرؔ تنہائیوں کی ریت پر شبنم بکھرتی ہے
کسی کی خوبصورت یاد میں دیکھا وہ نم اکثر

جہاں دیدہ

طوفانِ غم میں آ کے ہماری مدد کرے
دل کا دیا جلا کے ہماری مدد کرے

یا اپنا عکس چاند سے لے جائے نوچ کر
یا چاند کو بجھا کے ہماری مدد کرے

ہر فاصلہ مٹائیں گے، لیکن وہ شوخ بھی
دو اِک قدم بڑھا کے ہماری مدد کرے

خُوشبو کی ہم رکابی ہمیں بخش دے صبا
پھولوں کو گدگدا کے ہماری مدد کرے

ہم بھی اُسے اُسی کے لئے بھول جائیں گے
وہ بھی نہ یاد آ کے ہماری مدد کرے

جمال دہر

اُس سے کہو کہ چاہیے ہم کو بھی روشنی
کچھ دیر مسکرا کے ہماری مدد کرے

دم گھٹ نہ جائے صبر و تحمل کے حبس میں
کوئی ہمیں رُلا کے ہماری مدد کرے

وہ خوش ہوئے تو ہم کو بھی ہو گی خوشی ظفرؔ
وہ اپنا گھر بسا کے ہماری مدد کرے

رنگِ شب ہجراں بھی بہ اندازِ دگر ہے
اِس درد کا عنواں بھی بہ اندازِ دگر ہے

کام آتے نہیں ترکِ تعلق کے ارادے
یہ منزلِ آساں بھی بہ اندازِ دگر ہے

ہم شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح ہیں
امیدِ بہاراں بھی بہ اندازِ دگر ہے

سب سوختہ ساماں ہیں مکیں ہوں کہ مکاں ہوں
شہروں کا چراغاں بھی بہ اندازِ دگر ہے

شنوائی کا امکاں ہے نہ گویائی کا یارا
احوالِ دل و جاں بھی بہ اندازِ دگر ہے

لگتا ہے کہ اب کے میرے اندر سے اُٹھے گا
اندازۂ طوفاں بھی بہ اندازِ دگر ہے

ہم بھی تو بدلتی ہوئی اقدار میں بہتے
جب خاطرِ یاراں بھی بہ اندازِ دگر ہے

جبار ذیگا

ایدھی

جب تک رہا ہے زندہ ہمہ زندگی تھا وہ
اِک پیکرِ درخشاں سرِ تیرگی تھا وہ

شائد اِسی لئے بس وہی وہ دکھائی دے
چھوٹے سے ملک میں اِک بڑا آدمی تھا وہ

تا عمر وقفِ خدمتِ انسانیت رہا
مصروفِ خیر تا بہ دمِ آخری تھا وہ

اُس کی نظیر اپنے زمانے میں تھی کہاں
اُس عہدِ بے چراغ میں نقشِ جلی تھا وہ

جبار دبنگ

اُس نے کبھی کسی کو بھی مایوس نہ کیا
تا عمر ہم نے دیکھا اُسے کہ وہی تھا وہ

اِس سنتِ رسول پہ قائم رہا سدا
سب بے سہاروں کے لئے چھاؤں گھنی تھا وہ

کشکول اِک صدی کا لبالب بھرا گیا
خدمات کی خیرات میں کتنا سخی تھا وہ

تا حشر اُس کے ذکر کا پرچم کشا رہے
دستِ قضا نے جس کو چھوا سرمدی تھا وہ

جہاں دیدہ

محبت اب بھی میرا حوصلہ ہے
اِسی تعویذ سے ردِ بلا ہے

کوئی طوفاں اٹھا تھا پھونکنے کو
مرے شانے سے لگ کر سو رہا ہے

دھواں ہوتے نہیں ہیں یونہی چہرے
کوئی سورج کسی میں جل بجھا ہے

اِسی میں قوم کی صورت ہویدا
یہ جو دستِ گدا ہے آئینہ ہے

میں حرفوں میں لکیریں کھینچتا ہوں
مرا افسانہ لکھا جا چکا ہے

ابھی ہارا نہیں ہوں ظلمتوں سے
ابھی اک چاند مجھ میں جاگتا ہے

بالآخر ہو گئی تسخیر منزل
مگر جو اُس سے آگے راستہ ہے

جہاں دیگر

اُس کی آنکھوں سے بیاں تو ہوتا
میرے ہونے کا نشاں تو ہوتا

کھول لیتا میں سفر پاؤں سے
منتظر کوئی مکاں تو ہوتا

رہِ منزل بھی نظر آ جاتی
اُس کو احساسِ زیاں تو ہوتا

یونہی یکطرفہ محبت میں جلے
آگ جب تھی تو دھواں تو ہوتا

پاسِ ناموس تھا محفل میں تو پھر
کچھ نہ کچھ بعد ازاں تو ہوتا

آبلہ پائی کا ابلاغ ظفرؔ
نقشۂ کوئے بتاں تو ہوتا

تیرا ارماں مرے دل کا حصہ ہوا
گویا گرداب ساحل کا حصہ ہوا

میں تو بے ارماں جس جگہ بھی رُکا
آخرش کوئے قاتل کا حصہ ہوا

ایک مدت سے ہوں آبلہ پا جہاں
اب وہی میری منزل کا حصہ ہوا

وشت گردوں کی مٹی بکھرنے لگی
کوئی طوفان محمل کا حصہ ہوا

کل تھا میں جس مصیبت میں تنہا ظفرؔ
شہر والوں کی مشکل کا حصہ ہوا

جہاں دیگر

سودا مِلا نہیں کچھ دُعا کی دُکان سے
ہم قتل ہو کے نکلے شفا کی دُکان سے

کب تک بکیں گے اہلِ خبر کے دیار میں
جو زہر مل رہے ہیں دوا کی دُکان سے

اب کے نہ رہگزار سمجھ کر خریدنا
ہر گمرہی کو راہنما کی دُکان سے

لاحاصلی بھی زینتِ شوکیس دیکھنا
جب کہکشاں خریدو خلا کی دُکان سے

تم چُپ کی ریزگاری بھی رکھنا سنبھال کر
جز شور کیا ملے گا صدا کی دُکان سے

نکلی تھی گھر سے بہرِ خریداری مفلسی
لے آئی بھوک اہلِ سخا کی دُکان سے

اِٹھلاتا پھر رہا ہے یونہی دہر میں ظفرؔ
بندے کا بھاؤ پوچھو فنا کی دُکان سے

جہارنگ

شہادت مستقل اک سرخیٔ تحریرِ آزادی
لہو پیرایۂ مرداں ہے تفسیرِ آزادی

لہو کی شاہراہوں پر چلے تو پائیں گے منزل
غلاموں کے لئے ہے نسخۂ اکسیرِ آزادی

لگاتے جا رہے ہیں اپنی جانب سے ہمیں چرکے
بناتے جا رہے ہیں دل میں وہ تصویرِ آزادی

جو ہم کو آزماتے ہیں وہ آخر منہ کی کھائیں گے
ہم اُن سے چھین لیں گے ایک دن کشمیرِ آزادی

بنامِ امن کتنے معرکے درپیش ہیں اب بھی
نہ زنگ آلود ہونے دیجیئے شمشیرِ آزادی

ظفرؔ صورت گرِ امکاں ہیں اس قوم کے بیٹے
خرابے سے اٹھائیں گے نئی تعمیرِ آزادی

جہاد زندگی

مرا وطن سنوار دو!

نویدِ نوبہار دو، مرا وطن سنوار دو
روش روش نکھار دو، مرا وطن سنوار دو

ہر ایک ذرۂ وطن میں زندگی اُتار دو
نگارِ لالہ زار دو، مرا وطن سنوار دو

یہ آندھیاں، یہ بادلوں کی گھن گرج، یہ بجلیاں
سکون دو، قرار دو، مرا وطن سنوار دو

جو خود کو جان لیتا ہے، جہاں کو جان لیتا ہے
خودی کو اعتبار دو، مرا وطن سنوار دو

عداوتیں، عصبیتیں، مرے وطن کو کھا گئیں
ہر ایک سانپ مار دو، مرا وطن سنوار دو

جہاں دیگر

خزاں کی چیرہ دستیوں کے سامنے ڈٹے رہو
یہ بارِ غم اُتار دو، مرا وطن سنوار دو

جو برگ ہو سو امن کا، جو گُل کھلے سو پیار کا
ہوائے مشکبار دو، مرا وطن سنوار دو

یہ رنگِ رنگ کے ازم تو روک لیتے ہیں قدم
نظامِ کردگار دو، مرا وطن سنوار دو

صفوں میں ایسا نظم ہو کہ کارواں ہو یک بدن
قطار در قطار دو، مرا وطن سنوار دو

نئی نئی بلندیوں کی سمت ہم اڑے پھریں
وہ نقطۂ مطار دو، مرا وطن سنوار دو

قدم اُٹھیں تو نہ رُکیں، بڑھیں تو بس بڑھے چلیں
لہو میں وہ فشار دو، مرا وطن سنوار دو

میں پر سمیٹے ہوئے کیوں کسی شجر میں رہا
اُڑان بھرنے کا سودا جو بال و پر میں رہا

رہا نہ وقت کے عفریت سے کبھی خائف
"رہا تو سوئی ہوئی خاک کے خطر میں رہا"

گہر سا خواب تھا نہ جانے کن زمانوں کا
کھلی نگاہوں کی ان سیپیوں کے گھر میں رہا

میں اپنے ساحلِ ہستی کے ہاتھ کیا آتا
تمام عمر کسی اور ہی بھنور میں رہا

تو پھر تہی ہے کیوں دامن مرا ستاروں سے
اگرچہ کہنے کو زندہ تو عمر بھر میں رہا

جہاں دیدہ

غمِ حیات کی باتیں بھی پڑ گئیں ہلکی
عجیب حشر کسی حُسنِ فتنہ گر میں رہا

کبھی نہ دردِ مسلسل کو کر سکا ہے خجل
یہ اطمینان کہ میں دستِ چارہ گر میں رہا

میں زندگی کی ہمہ رنگیوں میں کھویا نہیں
ترا ہی غم مرے سامانِ مختصر میں رہا

جنونِ شوق ثمر پائے گا، بشرطِ حیات
یہیں سے رستہ نکل آئے گا، اگر میں رہا

یہ اور بات شبِ تیرہ کا حوالہ ہوں
میں حرفِ نور تھا دیباچۂ سحر میں رہا

یہیں پہ اُس نے مجھے خاک میں ملایا ہے
یہی تھا شہر جہاں ایک کوزہ گر میں رہا

گریز پائی منزل کی شدتوں کو تو دیکھ!
نہ پوچھ پہلے میں کیوں اس کی رہگزر میں رہا

جہاں دیگر

نویلے دن کی فسوں کاریوں سے خیرہ سہی
خمارِ شب بھی مگر دیدۂ سحر میں رہا

تمام عمر جیا جینے والوں کی صورت
جہاں میں رہنا سہل تو نہ تھا، مگر میں رہا

غمِ حیات ٹپکتا رہا قلم سے ظفرؔ
مگر یہ غم نہیں جاتا کہ بے ہنر میں رہا

بھیڑیوں کا فتویٰ

جن کی خونخواری ازل سے مثل ہے
امنِ عالم کے اُنھیں کو درد ہیں
اور ہے اُن بھیڑیوں کا فیصلہ
جس قدر بھیڑیں ہیں دہشت گرد ہیں

یادوں سے دل لگائے کئی سال ہو گئے
پانی میں گھر بنائے کئی سال ہو گئے

سیاحتِ جہاں سے نہ لوٹے تمام عمر
اپنے ہی گھر میں آئے کئی سال ہو گئے

اُس راستے میں کچھ بھی نہیں جز غبارِ شب
جس پہ نظر جمائے کئی سال ہو گئے

کیا ہمسفر نے ملنا ہے بعد از سفر مجھے
تنہا سفر میں آئے کئی سال ہو گئے

آیا ستم شعار نہ یادوں سے ماورا
آنکھوں میں خواب لائے کئی سال ہو گئے

جہاں زیب

ایسے عمل کا کوئی تو ردِ عمل بھی ہو
دیوار سے لگائے کئی سال ہو گئے

کیسا طلسمِ سخت ہے کہ ٹوٹتا نہیں
اِن دائروں میں آئے کئی سال ہو گئے

جو پھوٹتا رہا ہے تمھارے وجود سے
اُس نور میں نہائے کئی سال ہو گئے

جس نے مرے نقوش بنائے تھے دھوپ سے
بھر نہ سکا وہ سائے کئی سال ہو گئے

رنگ لا سکی نہ اپنے گماں کی مصوری
منظر ہمیں بنائے کئی سال ہو گئے

جو کچھ بھی پایا ہم نے اُسے کھو دیا ظفرؔ
اِس مشغلے میں ہائے کئی سال ہو گئے

جدائی کا ایک منظر

ریل گاڑی کی سیٹی بجی
اور ساری فضا شورشِ ہجر سے گونج اُٹھی
ایک ڈبے کی کھڑکی سے رستی ہوئی اُن نگاہوں کی چپ
اور میرے ارادوں کی کم ہمتی
ریل گاڑی کی وہ پٹریاں ہیں
کہ جن پر مرے خواب حسرت بنے جاتے ہیں

ریل گاڑی میں حرکت ہوئی
ساعتوں کے طلسمات بیدار ہونے لگے
جھنجھناتی ہوئی رخصتی کی صداؤں میں جیسے کوئی چابیاں بھر گیا
الوداع کے لئے ہاتھ اُٹھنے لگے
آخری بار میں نے اُن آنکھوں میں دیکھا
تو میری بھی آنکھوں میں سگریٹ کا کڑوا کسیلا دھواں بھر گیا

جواد شیخ

گھر سے کیا نکلوں کہ آلے مجھے فوراً ساون
میرے سر پر ہی بنا لے نہ نشیمن ساون

رات مجھ کو بھی کسی یاد نے بیکل رکھا
دیکھ سکتا ہے مری آنکھوں کی سوجن ساون

روتی رہتی ہے ٹپکتی ہوئی احساس کی چھت
بھرتا جاتا ہے مری روح کا برتن ساون

بڑی مشکل سے سمیٹا تھا بدن میں خود کو
آ گیا پھر سے مجھے لوٹنے رہزن ساون

مدتوں بعد بھی توفیقِ شکیبائی نہیں
وہی میں ہوں وہی بھیگا ہوا دامن ساون

بات بن سکتی نہیں گریۂ پیہم سے کبھی
یوں سلجھتی نہیں دل کی کوئی الجھن ساون

چشمِ گریاں کوئی بازیچۂ اطفال ہے کیا
کھیلتی پھرتی ہیں یادیں یہاں ساون ساون

جنسِ آسودگی کے نام پہ کیا لے آیا
بیچ کر عمر کے ہاتھوں میرا بچپن ساون

برق نے جھانک کے دیکھا ہے ابھی کھڑکی سے
روک لے گا میرا رستہ میرا دشمن ساون

ساری دنیا ہے کسی دیدۂ تر کی صورت
موسمِ ہجر کے ہاتھوں کا ہے درپن ساون

تیرے رونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے کا
پتھروں میں نہیں پڑتی ہے یوں دھڑکن ساون

جہاں دیگر

جب کہیں کوئی نہیں ہے تو ہے کیسی آہٹ
کیسے جائے گی مرے دھیان سے لپٹی آہٹ

خوش گمانی نے عجب شغل لگائے رکھا
کبھی دستک کوئی جاگی کبھی گونجی آہٹ

روشنی کیوں رہی امکان کی حد سے بھی پرے
جب سرِ زینۂ شب جاگ اُٹھی تھی آہٹ

حجرۂ خواب سے نکلا تو عجب کیف میں تھا
سرسراتی رہی اطراف میں یونہی آہٹ

مجھ سے اٹکھیلیاں کرتا رہا اِک شوخ گماں
مجھ کو چونکاتی رہی ہے میری اپنی آہٹ

جہاں زیب

سارے منظر ہیں زمانے کی ہوا کا ہدیہ
اپنے اندر سے نہ آئی مجھے کوئی آہٹ

جو مٹا تا رہا رستے سے ہر اک نقشِ قدم
نقش ہے اب بھی مرے دل میں اُسی کی آہٹ

میری دھڑکن کو ترے سینے کا روزن نہ ملا
میری ہر چپ میں سے رِستی رہی تیری آہٹ

ایک سایہ سا ہمہ وقت مرے ساتھ رہا
ایک خوشبو سی بکھیرے رہی پگلی آہٹ

جمار دیگر

تشنگی لب پہ دھری ہے آج بھی
وقت کی چھاگل بھری ہے آج بھی

برگِ دل پہ اوس سی ہے ہجر کی
کوئی ساعت رس بھری ہے آج بھی

دھوپ کے مقتل میں بھی ہے سرخرو
زندگی کی خود سری ہے آج بھی

راستے ہیں پر نظر آتے نہیں
کوئی سحرِ آزری ہے آج بھی

ہجر کا طوفاں تو کب کا جا چکا
مجھ میں خاصی ابتری ہے آج بھی

جہاں دیدہ

خود سے کرتا ہی نہیں مجھ کو رہا
اُس کی بندہ پروری ہے آج بھی

اب بھی ہے پیمانۂ سود و زیاں
عشق تو سوداگری ہے آج بھی

دامنِ دل تو دریدہ ہے ہنوز
دعویٰ بخیہ گری ہے آج بھی

بولتے ہیں رنگ چہرے کے ظفرؔ
جذبِ دل کی مخبری ہے آج بھی

میں تنہا نہیں

نہیں میری بیٹی میں تنہا نہیں
ہمیشہ مرے ساتھ رہتی ہو تم

میں جب بھی کوئی گیت سننے لگوں
تو آواز کے ساتھ بہتی ہو تم

میں جب بھی کوئی بات کرنے لگوں
مری بات کو آ کے کہتی ہو تم

میں جب بھی غزل کوئی لکھنے لگوں
تو قرطاس پر آن ڈھتی ہو تم

میں جب بھی کتابوں کو پڑھنے لگوں
تو نظموں فسانوں میں رہتی ہو تم

مرے سنگ بھرتی ہو قلقاریاں
مرا غم مرے ساتھ سہتی ہو تم

نہیں میری بیٹی میں تنہا نہیں

جمال زبیر

کسی آنسو کی طرح میں بھی بہا آخرِ شب
قطرۂ خوں سرِ رخسار ڈھلا آخرِ شب

عازمِ راہِ عدم بھی تھے عجب جادو میں
روک پائی نہ انہیں کوئی دعا آخرِ شب

سر پٹختی ہوئی موجوں نے پئے دیدہ وراں
اک فسانہ سرِ گرداب لکھا آخرِ شب

اب وہ محفل ہے نہ رونق ہے نہ رقاص نہ گیت
ڈوبتی جاتی ہے بربط کی صدا آخرِ شب

روشنی پھیل گئی مجھ میں نئے خوابوں کی
کیا خبر چاند نے کیا جھک کے کہا آخرِ شب

جہاز بیگ

گھول بیٹھا تھا مری ذات اندھیرے میں کہیں
میرے اندر کوئی آسیب سا تھا آخرِ شب

معرکہ ظلمتِ شب سے نہ ہو گر فیصلہ کُن
ہم بجھا دیتے ہیں خود اپنا دیا آخرِ شب

چپ کا اسلوب نئے خواب جگا دیتا ہے
پھیکے پڑ جاتے ہیں جب رنگِ نوا آخرِ شب

اِتنی آیاتِ محبت کے اُترنے پر بھی
دل کا تاریک ہے کیوں غارِ حرا آخرِ شب

پہچان کی دہلیز پہ لایا تھا اور بس
آئینے نے طلسم دکھایا تھا اور بس

شب کے خلاف سارا شہر اُٹھ کھڑا ہوا
میں نے تو اک چراغ جلایا تھا اور بس

جس کی طلب میں زندگی ساری خراب کی
اُس نے مجھے بھکاری ہی پایا تھا اور بس

پھر تو مجھے سمندر بھی پایاب ہی لگے
ایک ہی ندی نے مجھ کو ڈرایا تھا اور بس

کاٹی ہے ساری عمر ہی قیدِ حیات میں
اپنے بدن کو زنداں بنایا تھا اور بس

پھر یوں ہوا کہ اُن کا سفر نہ کبھی تھکا
چڑیوں کو اِک شجر سے اُڑایا تھا اور بس

میں اُس سے آگے آپ ہی بڑھتا چلا گیا
اُس ناخدا نے چلنا سکھایا تھا اور بس

پھر اُس کو بھولنے کا سلیقہ نہ آ سکا
کہنے کو کہہ دیا تھا پرایا تھا اور بس

جیون میں تُو تھا مجھ کو نشاں زد کئے ہوئے
میں کیا تھا کچھ نہ تھا تیرا سایہ تھا اور بس

تنہائیوں کی قبر میں اُترا ہوا تھا میں
اک یاد کے دیے کو بجھایا تھا اور بس

جہاں زیب

مسافتوں کو نیا مدعا بھی دے جاتا
مگر حیات کو وہ اک خلا بھی دے جاتا

اُسی کی شکل ہے نظروں کے سامنے ہر دم
وہ جاتے جاتے کوئی فاصلہ بھی دے جاتا

اُڑا ہوا ہے اسی بات پر دلِ سادہ
وہ جس نے زخم دیے تھے دوا بھی دے جاتا

بھلے وہ شعلۂ جاں کو بجھا کے رکھ دیتا
گھٹن کے واسطے لیکن ہوا بھی دے جاتا

طلب تھی اُس سے اگرچہ قبائے تن کی بہت
وہ اپنی خوشبو بہ دستِ صبا بھی دے جاتا

سزا سناتا اگر جرمِ آگہی کی مجھے
تو اس طرح کہ نیا حوصلہ بھی دے جاتا

وہ چُپ بھی ہوتا تو اس بانکپن کے ساتھ ظفرؔ
لبِ خموش کو ذوقِ نوا بھی دے جاتا

ہم یوں اپنے بدن میں لپٹے تھے
جیسے صحرا چمن میں لپٹے تھے

کتنے لمحے گئے زمانوں کے
زندگی کے کفن میں لپٹے تھے

میرے اندر بغاوتیں یوں اٹھیں
کچھ اندھیرے کرن میں لپٹے تھے

آگ پہنی ہوئی تھی ظالم نے
جس سے دیوانہ پن میں لپٹے تھے

پھول جھڑتے تھے اُن کے ہونٹوں سے
اور کانٹے سخن میں لپٹے تھے

جہاں زیب

یاد

آج میں خود میں نہیں
پھر کوئی دیرینہ سرشاری تمہاری یاد کی
یوں ابھر آئی ہے میرے دیدہء غماز میں
مجھ کو لگتا ہے کہ جیسے دل مرا سینے سے باہر آ گیا

جہاں زیب

گھر کی ہر شے میں تمہارے لمس کی خوشبو مجھے دیوانہ کرتی ہے بہت
دھڑکنوں میں پھر کوئی زنجیر سی چھن چھن چھنکتی ہے بہت
زندگی ہر چیز سے رستی ہوئی محسوس ہوتی ہے مجھے
طاق میں رکھی ہوئی تصویر میں جب دیکھتا ہوں تو تمہاری آنکھ میں
اک روشنی محسوس ہوتی ہے مجھے
آج کوئی عکس آئینے سے باہر آ گیا

آج میں خود میں نہیں
سرسراتی ہیں ہواؤں میں تمہاری دلربا سرگوشیاں
تھرتھراتی ہیں مرے اطراف میں چاروں طرف کھوئی ہوئی سچائیاں
ٹمٹماتی ہیں تمہاری دلکشا پرچھائیاں
عشق گویا مرنے اور جینے سے باہر آ گیا

بھرم توڑا نہیں کرتے
سنو ایسا نہیں کرتے

اگر پورا نہ کر پاؤ
تو پھر وعدہ نہیں کرتے

جلا نہ دھوپ میں ہم کو
اگر سایہ نہیں کرتے

جو شبنم سے سلگ اٹھے
اُسے شعلہ نہیں کرتے

اُنہیں جس دل میں رکھا ہے
اُسے میلا نہیں کرتے

جمال زبیر

یہ کن راہوں پہ آ نکلے
شجر سایہ نہیں کرتے

وہ جن کو جینا آ جائے
غمِ رفتہ نہیں کرتے

ظفؔر ہو فیصلہ دل کا
بہت سوچا نہیں کرتے

جہاں دیگر

دردِ آشنا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ
تو بھی سدا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

مفہومِ زیست پائیں مرے دل کی دھڑکنیں
دل کی صدا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

میری ہتھیلیوں کی لکیروں میں ڈوب جا
رنگِ حنا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

تیرے بغیر سخت کٹھن ہے رہِ حیات
ماں کی دعا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

پھر ازسرِ نو عہدِ وفا استوار ہو
پھر ابتدا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

پیغامبر ہوں فصلِ گُل و لالہ کا ظفرؔ
موجِ صبا کی طرح مرے ساتھ ساتھ رہ

جہاں دیگر

اُسے بھول جانا بجا سہی مجھے اس سے عار کہاں رہا
مگر اپنے آپ پہ اِس قدر کبھی اختیار کہاں رہا

غمِ تیرگی مجھے ڈس گیا، میں کرن کرن کو ترس گیا
یہ جو ماہتاب ہے ضو فگن، شبِ انتظار کہاں رہا

غمِ دل جو حد سے گزر چلے تو میں کس کے کاندھے پہ سر دھروں
تری یاد آئے تو کیا کروں، کوئی غمگسار کہاں رہا

نہ کسی کے دل میں جلے دیا، نہ کسی کا غرفۂ چشم وا
میں کروں گا کیا ترے شہر میں، مرا انتظار کہاں رہا

کوئی بیکلی سی ابھی بھی ہے، کوئی تشنگی سی ابھی بھی ہے
وہ جو تیر آ کے لگا مجھے، وہ جگر کے پار کہاں رہا

جمال رنگ

میں بھی اپنی دنیا کا ہو گیا، غمِ روزگار میں کھو گیا
مجھے آ گیا ہے سکون تو وہ بھی بیقرار کہاں رہا

اُسے طعنہ دینے سے پیشتر میں یہ کیوں نہ خود سے بھی پوچھ لوں
مرے دل میں بھی تو بنا تھا یادوں کا اک مزار کہاں رہا

کسی ایک مشعل بدست کو بھی ملی نہ منزل تو کیا عجب
پئے رہرواں کوئی راستہ بھی تو سازگار کہاں رہا

جہاں دیگر

عکس عالم کے ہمارے آئینوں میں قید تھے
ہم مگر لاحاصلی کے زاویوں میں قید تھے

در تھے ہر دیوار میں لیکن قدم اُٹھتے نہ تھے
ہائے کیسا خوف تھا، کن مقتلوں میں قید تھے

کتنی مدت سے نہیں سوئے سحر کی آس میں
جھٹپٹے کا وقت تھا یا ظلمتوں میں قید تھے

عمر بھر چلتے رہے منزل مگر آئی نہیں
جست بھر کے راستے کن فاصلوں میں قید تھے

نیتِ ترکِ مراسم بے سبب کرتے رہے
نام کچھ ایسے بھی تھے جو دھڑکنوں میں قید تھے

واہموں کے کیسے زنداں تھے ہمارے چار سُو
رونقِ محفل تھے اور تنہائیوں میں قید تھے

کیسی کیسی نعمتیں تھیں زندگی کے طشت پر
ہم خدا معلوم کیسے ذائقوں میں قید تھے

جہارِ دنیا

جستجو میں دلِ بیتاب تو رہتا ہو گا
بند آنکھوں میں کوئی خواب تو رہتا ہو گا

بستیاں پار بسی ہیں تو بسی ہیں کیسے
یہ سمندر کبھی پایاب تو رہتا ہو گا

چھیڑ بیٹھا تھا کبھی جو مرے تارِ دل کو
تیرے ہاتھوں میں وہ مضراب تو رہتا ہو گا

دست و پا یونہی تو شعلے نہیں اگلا کرتے
جسم کے ظرف میں تیزاب تو رہتا ہو گا

اے مرے کاتبِ تقدیر مرے جیون میں
میرے لکھنے کو کوئی باب تو رہتا ہو گا

جہاز بیگ

دل کی شادابی سے لگتا تو نہیں ہے لیکن
اس جزیرے میں بھی سیلاب تو رہتا ہوگا

میرے رستے میں کوئی کوہِ ندا ہو کہ نہ ہو
واہمہ برسرِ اعصاب تو رہتا ہو گا

یوں تو وحشی نے سدا بزم میں اپنی کی ہے
یہ مگر واقفِ آداب تو رہتا ہو گا

رتجگے سونپ دیے جس نے مری آنکھوں کو
وہ مرے واسطے بے خواب تو رہتا ہوگا

کوئی بتلاؤ کہ انگاروں کی اِس بستی میں
رتبۂ گوہرِ نایاب تو رہتا ہو گا

کیسے سمے کو چیر کر نکلا ہے رستہ چاند کا
اب کے تو شب زادوں نے بھی کھیلا ہے مہرہ چاند کا

بے نام تاویلوں کے گرہن میں ہے سر ڈالے ہوئے
نقشہ نویسوں نے کہاں بدلا ہے نقشہ چاند کا

آنکھوں کو کھلنے ہی نہیں دیتی یہ ظالم تیرگی
سب کو خبر ہے رات بھر بہتا ہے چشمہ چاند کا

میدان تو آخر کو رہنا ہے سحر کے ہاتھ میں
کس زعم میں شب نے سجا رکھا ہے تمغہ چاند کا

تم دیکھنا اِک روز پریوں کی کہانی کی طرح
بچوں کو ہم نے بھی سنانا ہے فسانہ چاند کا

جانے نگاہوں میں سیاہی کس طرح پھیلی رہی
ہم آپ نے کرنوں سے بھر رکھا تھا بستہ چاند کا

ہوگا نوشتہ وقت کا ہر شہر کی دیوار پر
چھپنے کو آیا ہے فضاؤں میں ضمیمہ چاند کا

فکرِ سود و زیاں سے اُٹھتا ہے
دل ترے خاکداں سے اُٹھتا ہے

جس کے دم سے تھی انجمن آباد
اب وہی درمیاں سے اُٹھتا ہے

اِک ستارہ جو تیرے نام کا تھا
حجرۂ کہکشاں سے اُٹھتا ہے

کوئی کُوئے نگار سے یُوں اُٹھا
جیسے خوابِ گراں سے اُٹھتا ہے

سُرخیٔ داستان بن کے کوئی
کیوں مری داستاں سے اُٹھتا ہے

جبار دیگ

کس کی یادوں کی آہٹیں جاگیں
زلزلہ جسم و جاں سے اُٹھتا ہے

اِک ستم ہے ستم پہ چپ رہنا
حشر کچھ تو فغاں سے اُٹھتا ہے

جانے کس کو جلا کے راکھ کرے
ایک شعلہ زباں سے اُٹھتا ہے

بجلیاں ہوں نہ ہوں سحابوں میں
اعتبار آسماں سے اُٹھتا ہے

یونہی پڑتی ہے قافلے کی بناء
میں یہاں تُو وہاں سے اُٹھتا ہے

پُوچھتا ہے لگا کے آگ ظفرؔ
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

جھارڈیگا

لبِ دریا کوئی ملا ہی نہیں
مجھ سا تشنہ کوئی ملا ہی نہیں

عمرِ رفتہ کی ہے خبر کس کو
جانے والا کوئی ملا ہی نہیں

دل کی رُوداد آنسوؤں سے لکھی
اور خامہ کوئی ملا ہی نہیں

فکرِ منزل سے جان چھوٹ گئی
ہم کو رستہ کوئی ملا ہی نہیں

قفل شکنی نہ ہو سکی دل کی
تیرے جیسا کوئی ملا ہی نہیں

میرے بھرم کو کس لئے بے آبرو کرے
جو میری بات ہے وہ مرے روبرو کرے

تیری گلی سے آگے کوئی راستہ نہیں
دیوانہ منزلوں کی کہاں جستجو کرے

خلوت کدۂ شب میں مچلتا ہے جی بہت
اُترے زمیں پہ چاند، تری گفتگو کرے

کیسی جراحتوں کا تقاضہ ہے دوستو
وہ تارِ دل یا تارِ گریباں رفو کرے

لب بستگی سے اور نمایاں ہیں رازِ غم
اندر کی چُپ تو شور مرے چارسو کرے

قربان کیوں نہ کاوشِ گلچیں کے جایئے
بہ اہتمام بادِ صبا کو جو لو کرے

جہاں دیگر

سودا تھا کس کو ترکِ مراسم کا یاد کر
کیوں آبدیدہ ہو کے مجھے یاد تُو کرے

کیا کیا نہ چھیڑ دیں مرے آنسو حکایتیں
جب چاند آ کے بات لبِ آبجُو کرے

ہم برگِ خشک کی طرح اُڑتے ہیں دربدر
کچھ معجزہ تو آپ کا ذوقِ نمُو کرے

اک بار ٹوٹ جائے جو زنجیر مان کی
تا زندگی یہ دل نہ کوئی آرزو کرے

اُس کو بھی میرے عشق کی بیتابیاں ملیں
میری طرح وہ یاد مجھے بھی کبھو کرے

دل کو ہے اختیار مرے باب میں ظفؔر
جو میرے حق میں چاہے سو میرا گرو کرے

احساس کی وکٹ پر بُرا کھیلنے لگے
ہم اپنی آگہی سے جوا کھیلنے لگے

کیا رُوپ ہیں جو میری نظر کے طفیل ہیں
رخسار پر بہ رنگِ حیا کھیلنے لگے

یاروں نے کیچ کر لی محبت کی بیکلی
ہم تم پہ سزا و جزا کھیلنے لگے

ہر ہر سمے کی پچ پر ہیں خود آزمائیاں
ہر حادثے سے اہلِ دعا کھیلنے لگے

اربابِ میداں رہنے لگے مستقل خفا
ہم سے ہوئی بس اتنی خطا، کھیلنے لگے

جہانِ دیگر

پاؤں سے جو بندھا ہے وہ چکر اُتار دے
آوارگی کے شوق کو گھر پر اُتار دے

کب تک کسی کی یاد کو دل سے لگائے گا
یونہی چڑھی ہوئی ہے یہ سر پر، اُتار دے

اِک عمر کے سفر سے بدن ہے نڈھال سا
یہ وہ تھکن نہیں ہے کہ سو کر اُتار دے

ظلمت کسی بھی دُرز سے داخل نہ ہو سکے
ہر آسماں پہ چاند کا منظر اُتار دے

آخر رہے گی ہجر کی عدت میں کب تلک
ماتھے سے ایک نام کا جھومر اُتار دے

جہاں دیدہ

جب بھی کسی کے ذکر کے دامن کو تھام لے
اشعار میں دھنک سی سخنور اُتار لے

یوں اشتہار تجھ سے اُتارے نہ جائیں گے
دیوار کا تمام پلستر اُتار دے

کب تک جئے گا بیتی ہوئی ساعتوں میں تو
گزرے ہوئے برس کا کلینڈر اُتار دے

خاموش ہو تو جیسے سزا دیتا ہو مجھے
بولے تو جیسے روح میں خنجر اُتار دے

اِس تشنگی کی آگ نے بجھنا نہیں ظفرؔ
چاہے تو خود میں سارا سمندر اُتار دے

ڈور کیوں شہر سے بیٹھے ہو اٹھو اور چلو
جو مسائل ہیں انہیں فیس کرو اور چلو

روکتے ہیں ترے قدموں کو گماں کے آسیب
اب بھی منزل ہے بہت دور چلو اور چلو

زندگانی کا سفر کم نہیں ہونے والا
عمر کی راکھ کو چہرے پہ ملو اور چلو

تیری تنہائی نے مجمع سا لگا رکھا ہے
سرِ محفل یوں تماشہ نہ بنو اور چلو

مڑ کے دیکھو گے تو پتھر کے بھی ہو سکتے ہو
کسی آواز پہ مت کان دھرو اور چلو

جہاں دیگر

کسی پل کو یونہی قدموں سے لپٹنے تو نہ دو
اپنی آنکھوں میں نئے خواب پرو اور چلو

ہم تو دنیا میں مسافر کی طرح ہیں پیارے
تم بھی کچھ اپنی کہو میری سنو اور چلو

منزلِ جاں سے بھی آگے ہیں بہت سے رستے
خود کو دلدل نہ کرو دیدہ ورو اور چلو

جہاں دیگر

اپنے عمل سے وقت کو ایسا جواب دے
جس پر زمانہ انگلیاں دانتوں میں داب دے

شادابیوں کو زندگی کے کینوس میں لا
جھلساتے موسموں کو بھی رنگِ سحاب دے

اوروں کی سمت انگلی اٹھانا تو سہل ہے
اہلِ نظر کو اہلیتِ احتساب دے

کیوں ظلمتِ بسیط ہے ہر سمت، کچھ تو کہہ!
کس خاک میں تھے کتنے ستارے حساب دے

آنکھوں میں ابتسام کی شمع جلا کے رکھ
مجھ کو بھی ایک میٹھی نظر کا ثواب دے

جبار مرزا

میرے تمام خواب بنے ہیں عذاب کیوں
زنبیلِ دل الٹ دے، وفا کا حساب دے

کب تک رہے گی اس مین خزاؤں کی بیکلی
میرے لہو کے رنگ سے گلشن کو آب دے

پھر سے ہو مجھ کو جرمِ محبت کا حوصلہ
پھر سے مری کتاب کو تو انتساب دے

جہاں زیب